



# JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online): 1816-3424  
Volume No. 40, Issue No.01

## JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.

It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

## CONTACT

**Dr. Muhammad Khawar Nawazish**  
Editor, Journal of Research  
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:  
+92 300 9561745

WEBSITE:  
<https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/>

EMAIL:  
[jorurdu@bzu.edu.pk](mailto:jorurdu@bzu.edu.pk)  
[khawarnawazish@bzu.edu.pk](mailto:khawarnawazish@bzu.edu.pk)

## ADDRESS

Office of the Journal of Research  
(Urdu), Department of Urdu,  
Bahauddin Zakariya University, Multan

## TITLE OF THE PAPER

بھیشم ساہنی اور کرشن چندر کے افسانوں میں تقسیم 1947ء کا بیان

## AUTHOR(S)

- \* **Dr. Muhammad Said Ali**  
Lecturer, Department of Urdu  
Ghazi University, DG Khan
- \*\* **Shazma Zahra**  
Lecturer, Department of Urdu  
Govt. Associate College for Girls, Choti Zareen, DG Khan

## CONTACT

- \* [saidalijatoi14@gmail.com](mailto:saidalijatoi14@gmail.com)
- \*\* [honey.honeykhan786@gmail.com](mailto:honey.honeykhan786@gmail.com)

## HISTORY OF THE PAPER

Received on: October 28, 2024  
Accepted on: June 25, 2024  
Published on: June 30, 2024

## DETAIL(S)

Volume No. 40, Issue No. 01, Page No: 42-54  
Publisher:  
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University  
Multan (Pakistan)-60800

## LICENSE



This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

## COPYRIGHT

©The author(s) 2024. ©Journal of Research (Urdu) 2024.  
This publication is an open access article.

\* ڈاکٹر محمد سید علی \*\* شازمہ زبرا

## بھیشم ساہنی اور کرشن چندر کے افسانوں میں تقسیم 1947ء کا بیان

### Narrative of Partition 1947 in the Short Stories of Bheesham Sahni and Krishan Chandr

#### ABSTRACT

The partition of the subcontinent in 1947 is an important event. It has had a profound effect not only on the region but also on the world. The migration and riots that resulted from this division have been viewed differently by different people. But it is the Hindus, Sikhs and Muslims who have suffered the most. Bheesham Sahni is a writer of Hindi language and literature and Krishan Chandr is a writer of Urdu Language and Literature. Although both are Hindus. But both have the readers of different mind sets. This article examines the statements made by two different language and thought-provoking fiction writers about partition, migration and riots.

#### KEYWORDS

Narrative, Partition, Subcontinent, Shortstory, Colonialism, Progressive, Symbol

بھیشم ساہنی کو اپنے بھائی بلراج ساہنی کے ساتھ راولپنڈی سے نئے ہندوستان جانا پڑا۔ مگر تقسیم کا یہ دکھ ان دونوں بھائیوں کے لیے ایسی بھٹی ثابت ہوا کہ دونوں کنڈن ہو گئے۔ بلراج ساہنی بھارتی فلموں (دو بگھاڑی، دھرتی کے لال، کابلی والا، چھوٹی بہن اور گرم ہوا وغیرہ) کے کامیاب ہیرو تھے تو بھیشم ساہنی ہندی ساہتیہ کے اہم لیکھک۔ ان کی تحریروں میں مہاجرت کا دکھ اور اپنی دھرتی کا سوز ملتا ہے۔ ناول 'اتمس' (اندھیرا) میں تقسیم سے ذرا پہلے کے حالات، راجہ بازار کی جامع مسجد کے سامنے سور پھینک دینے کے بموجب اٹھنے والے ہندو مسلم فسادات اور بٹوارے کا درد صاف دکھائی دیتا ہے۔

بھیشم ساہنی نے تقسیم ہند سے متعلق ڈھیروں کہانیاں بھی لکھیں۔ ان کا قلم تقسیم، ہجرت اور فسادات کا بڑھیا عکاس بھی ہے اور نقاش بھی۔ افسانہ 'پالی' میں ایک ہندو جوڑے منوہر لال اور کوشلیہ کی کہانی بتائی گئی ہے۔ کہ

جب لٹے پھٹے ہندوؤں کے ساتھ ہندوستان کی جانب مسافرت کے وقت ان کا بیٹا 'پالی' پاکستان میں چھوٹ جاتا ہے اور بیٹی بلوائیوں کے حملے میں ماری جاتی ہے تو کوشلیہ اولاد کے غم میں نیم پاگل ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں فسادات کا منظر بھیشم ساہنی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"لاریوں کا قافلہ اندھیرے میں آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک اس پاس کے کھیتوں سے کچھ لوگ نکل آئے۔ چیختے چلاتے بھاگتے ہوئے وہ سڑک پر آگئے۔۔۔ رات کے اندھیرے میں پھر وہ چیخ و پکار اور گریہ و زاری کی آوازیں سنائی دینے لگیں جنہیں منوہر لال اور کوشلیہ اپنے قصبے میں سُن چکے تھے۔ چاروں جانب دوبارہ خون کے چھینٹے اڑنے لگے۔" (1)

ادھر 'پالی' بے اولاد زینب اور شکور کی گود میں (مولوی کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہو کر) الطاف بن جاتا ہے۔ مگر کوشلیہ کی حالت زار کے بموجب چار سال کی انتھک کوششوں سے جب منوہر لال سماجی کارکنوں، مجسٹریٹ اور سرکاری اہلکاروں سمیت شکور احمد برتن فروش کے گھر جا پہنچتا ہے تو مولوی صاحب کے ہاتھوں ایک اور معمہ جنم لے لیتا ہے:

"اب یہ مسلمان کا بیٹا ہے، کافر کا بیٹا نہیں ہے۔ اب یہ کلمہ پڑھ چکا ہے۔۔۔ بچہ کس کا ہے، یا اسے کس نے پالا ہے، یہ بات پس منظر میں چلی گئی تھی، سوال دوبارہ ہندو مسلمان کا بننے لگا تھا۔" (2)

لیس جی، سماجی کارکنوں اور ہندوستان پاکستان کے سرکاری اہلکاروں کی کوشش اور پالنے والی کی پُر خلوص ممتانے منوہر لال کو اس کا بچہ پلٹا تو دیا مگر بھارت پہنچنے پر گاؤں والوں نے الطاف کا عجب استقبال کیا۔ ماں کے گلے لگانے سے پہلے ہی پنڈت اور پنچ نے اسے شدھ کرنے کا اعلان کر دیا:

"کیا نام ہے تیرا؟" بچے نے بھاری بھر کم چودھری کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھا اور سہمی ہوئی آواز میں کہا، 'الطاف! الطاف حسین ولد شکور احمد'۔۔۔ انہیں، تیرا نام پالی ہے۔

یشپال!۔۔ نائی ہتھیلی پر استرے کو تیز کر کے پنڈت کی ہدایت کے موجب لڑ کے کا

منڈن کرنے لگا۔" (3)

افسانے میں بھیشم ساہنی کا کھلا بیانیہ موجود ہے۔ ان کا موقف واضح ہے کہ تقسیم معصوم عوام کی وجہ سے نہیں تھی۔ عوام کی فکر تو اپنی اور اولاد کی خوشحال زندگی تھی۔ ایک دوسرے کے لیے ڈھیر ساری محبت اور انسانیت تھی۔ تقسیم تو مذہب پنڈتوں، مولویوں، چودھریوں، سرداروں اور مذہبی و سیاسی ٹھیکیداروں کا مسئلہ تھی۔ تقسیم کے نام پر مارکٹ بھی انگریز سامراج اور اس کے انہی مذہبی و سیاسی کارندوں کا شاخسانہ تھی۔ یہ ظلم و بربریت اور جنگ و جدل کا کھیل اب بھی جاری ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے نہ کبھی امن کو پنپنے دیا اور نہ ہی انسانیت سوز اعمال کو تھمنے دیا۔ یہی وجہ تھی کہ بٹوارہ ہوجانے کے سالوں بعد بھی:

"ملک کی تقسیم کے بعد سڑکوں اور راستوں پر خون کے چھینٹے سوکھ تو گئے تھے لیکن ان کے داغ ابھی مٹے نہیں تھے۔ جلتے گھروں کی آگ تو ٹھنڈی پڑ گئی تھی لیکن ان کے ڈھانچے اب بھی جگہ جگہ کھڑے تھے۔ تقسیم کے وقت کا جنون تو بڑی حد تک ٹھنڈا پڑ چکا تھا لیکن اس کا بچا کچھ ناغم و غصہ ابھی لوگوں کے ذہنوں سے مٹا نہیں تھا۔" (4)

تقسیم ہند جہاں خود ایک بڑا واقعہ تھا وہاں اس نے کئی بڑے واقعات کو بھی جنم دیا۔ ان کو اگر شہ سُرخیوں میں یاد کیا جائے تو بٹوارے کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت اور فسادات سرفہرست رہتے ہیں۔ دونوں اطراف خون کی ہولی بھی کھیلی گئی اور آنسوؤں کے دریا بھی بہے۔ عزت و آبرو کی چادر بھی لٹی اور امید و مان کے باندھ بھی ٹوٹے۔ یہ کوئی معمولی آندھی نہ تھی کہ کچھ تباہی کے بعد تھم جاتی۔ یہ کبھی نہ تھمنے والا طوفان تھا جو اپنے ساتھ سب کچھ بہالے گیا۔

بھیشم ساہنی کے دو اور افسانے "نیمت" (جھٹپٹا) اور "امر تسر آ گیا ہے" بھی تقسیم برصغیر اور ہجرت و فسادات کے لیے سے متعلق ہیں۔ ثانی الذکر افسانے میں بٹوارہ ہوتے ہی کہانی سنانے والا کردار دہلی میں آزادی کی تقریب میں شرکت کرنے واسطے جا رہا ہے۔ ٹرین مسلمان، سکھوں اور ہندوؤں سے کچھ کھچ لدی ہے۔ یہ سفر پٹھان مسلمانوں کی طرف سے ہنسی مذاق، پھبتیوں اور جملوں کے تبادلے میں کٹ رہا ہے۔ جہلم اور وزیر آباد میں فسادات کی خبریں پھیل رہی ہیں۔ راستے میں ایک بوڑھا ہندو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ٹرین میں سوار ہونے لگتا ہے تو پٹھان جگہ

کی کمی کا عذر کرتے ہوئے اسے ڈبے سے بڑی طرح دکھیل دیتا ہے۔ ریل بھانت بھانت کے لوگوں سے بھری ہے مگر اس سفاکیت کو روکنے والا کوئی نہیں۔ لیکن جب گاڑی لاہور سے امرتسر پہنچتی ہے تو ان میں سے ایک ڈراسہا ہندو بابو اچانک شیر ہو جاتا ہے اور پٹھانوں کا غصہ گاڑی میں سوار ہوتے ایک مسلمان جوڑے پر ڈنڈے برساکر اُتارتا ہے۔ بھیشم ساہنی کے مطابق عوام یہ تک نہ جانتی تھی کہ بٹوارا اصل میں ہے کیا اور اکثریت تو اس کو ایک کھیل تماشا سمجھ رہی تھی۔ وہ یہ تک نہ جانتے تھے کہ ہندوستان پاکستان یوں دو حصوں میں بٹ رہے تھے۔ اور ان میں ایک ایسی مضبوط دیوار اٹھائی جا رہی تھی جسے یا جوج ماجوج بھی نہ چاٹ سکیں گے:

"انہی دنوں پاکستان کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا اور لوگ طرح طرح کے اندازے لگانے لگے تھے کہ مستقبل میں زندگی کا خاکہ کیسا ہو گا۔۔۔ سردار جی بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ پاکستان بن جانے پر جناح صاحب بمبئی میں ہی رہیں گے یا پاکستان میں جا کر بس جائیں گے، اور میرا ہر بار یہی جواب ہوتا: بمبئی کیوں چھوڑیں گے، پاکستان میں آتے جاتے رہیں گے، بمبئی چھوڑ دینے میں کیا تک ہے!" (5)

باپ دادا سے ایک دوسرے کے سنگ رہنے والے خاندان، یار دوست اور عام لوگ نہ جانتے تھے کہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں، ممبئی اور کراچی کا بٹوارہ ہو چکا ہے۔ نہ ہی کسی امرتسر والے ہندو، سکھ نے یہ گمان کیا تھا کہ شری رام کے بیٹے لو کے نام پہ بننے والا شہر 'لاہور' ان سے اتنا قریب ہو کے بھی بہت دور ہو جائے گا:

"لاہور اور گرداس پور کے بارے میں بھی اندازے لگائے جا رہے تھے کہ کونسا شہر کس طرف جائے گا۔۔۔ کچھ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر جا رہے تھے، جبکہ دوسرے لوگ ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون سا قدم ٹھیک ہو گا اور کون سا غلط۔" (6)

بھیشم ساہنی نے کوئی الگ سوال نہیں اٹھایا۔ یہ سوال تو اس وقت ہر ذی شعور اور ہر بے شعور کے ذہن میں تھا۔ مذہبی غیر مذہبی، سیاسی غیر سیاسی، ہر کوئی یہ جاننا چاہتا تھا کہ کس کے حصے میں کونسا ٹکڑا پھینکا جا رہا ہے؟ سکھ بے خبر تھے کہ ان کا مدینہ ان سے چھینا جا رہا ہے۔ صوفی انجان کہ معین الدین چشتی اور نظام دین اولیاء ان سے دور کیے جا

رہے ہیں اور عشاق بے خبر کہ تاج محل اب ان کا نہیں رہا۔ ایک سیلاب تھا جو سبھی کو اپنے ساتھ بہائے جا رہا تھا۔ مگر کچھ ایسے تھے جو اپنی مٹی کو کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کو راضی نہ تھے۔ منٹو کا ایک پاگل کردار سیاسی و مذہبی گتھیوں سے کہیں دور اپنی دھرتی ماں، اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے لیے بلک رہا تھا۔ اسے ہندوستان پاکستان سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ مطلب تھا تو صرف اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔

کرتھن چندر اردو کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ "ہم وحشی ہیں" توپورا کا پورا آزادی، ہجرت اور فسادات کا عکاس ہے۔ مشہور ترقی پسند ادیب اور نقاد علی سردار جعفری نے اس کا دیباچہ لکھا اور تقسیم کے بعد ہونے والے فسادات کو انقلاب دشمن لشکر کا حملہ اور گہری سازش بتایا ہے:

"آج کی خانہ جنگی ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی نفرت کی لڑائی نہیں ہے۔ بلکہ انقلاب اور آزادی کے قلعے پر انقلاب دشمن لشکر کا حملہ ہے۔ جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی بیر سے تقویت پہنچ رہی ہے۔۔۔ انگریز افسروں کی رہنمائی میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر اور مغربی پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں پر گولی چلی۔ پنجاب کے حاکموں نے فساد کرنے والے غنڈوں کی امداد کی۔" (7)

ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں نفرت کی دہلی ہوئی چنگاری کو وڈیروں، سپیٹھوں، مقامی جاگیرداروں اور انگریز افسروں نے ہوا ضرور دی مگر یہ نفرت اور زہر تو ان کے اندر پہلے سے ہی موجود تھا۔ کیا مذہبی پیشوا انسانیت کا درس نہیں دیتے؟ وہ سید الانبیاء کی ذات ہو یا مہاتما بدھ، گردونانک ہوں یا یسوع مسیح، شتوہوں یا موسیٰ، یا مظلوموں کے حقوق واسطے لڑنے والا کارل مارکس ہو، کسی بڑے نے آج تک وحشت و بربریت کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ تو سب امن اور انصاف کے داعی تھے۔ تو آج مشرقی پنجاب مسلمانوں سے اور مغربی پنجاب کی بستیاں ہندوؤں اور سکھوں سے خالی کیوں ہو چکی ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس ملک میں کبھی گوتم بدھ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ ایشیا کے کانوں نے عرب کے رسول کی آواز کبھی سنی ہی نہیں تھی۔ جیسے اجنتا کے نقوش کبھی

نہیں ابھرے تھے۔ ایلورا کے بت کبھی نہیں تراشے گئے تھے۔ تاج محل کبھی نہیں بنا  
تھا۔ ٹیلور اور اقبال نے اپنے گیت کبھی نہیں گائے تھے" (8)

یہ نفرت جو انسانی جسموں سے پیپ کی طرح رس رہی تھی اور صدیوں سے سوئی وحشت جاگ اٹھی تھی۔  
یہ تہذیب و تمدن کا خول جو کسی صدیوں پرانے اژدھا کی کینچلی کی طرح اتر چکا تھا۔ اب دوبارہ انسانیت کا روپ کیسے  
دھارے گا۔ یسوع مسیح کب تک دوسروں کے گناہوں کی سزا اٹھائے گا۔ یہ نفرتوں اور حقارتوں کا زہر، شوجی، گاندھی  
جی اور محمد علی جناح سے نہیں چوسا جائے گا۔ تو کون مداد ادا ہوگا انسانیت کا؟ علی سردار جعفری تمام ادیبوں کو دعوت دیتے  
ہیں کہ آئیے ہنگامی ادب کا طعنہ دینے والوں سے نہ ڈریے اور کرشن چندر کی طرح انسانوں کو پھر سے انسانیت کی طرف  
بلائیے۔ ورنہ:

"انسانی خون کا سیلاب ان ادب پاروں کو بہا لے جائے گا۔ ہمیں ابھی اتنی کتابیں لکھنی  
ہیں کہ ہم ان کے ڈھیر سے بند باندھ سکیں۔ پُشتے بنا سکیں۔ اس کو ہنگامی ادب کہہ کے  
صرف وہی لوگ ٹال سکتے ہیں جن کی روحیں سڑ گئی ہیں اور شعر و فن کے چشمے خشک  
ہو گئے ہیں۔" (9)

سیر مسعود اپنے ایک مضمون "تقسیم اور اُردو افسانہ" میں بتاتے ہیں کہ کچھ پاپولر افسانہ نگاروں نے تقسیم،  
ہجرت اور فسادات میں اپنے قارئین کی منشا کو دیکھا اور کچھ ایماندار ادیبوں نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے  
حق سچ کا ساتھ دیا اور فقط قارئین کی وجہ سے اپنا حقیقی بیانیہ نہیں بدلا۔ ان افسانہ نگاروں نے بہترین تکنیکوں سے کہانی  
کو سجا یا۔ کچھ بڑے ادیبوں نے پہلے اور بعد کی صورت حال کو بیان کر کے بھی حقیقت کو اجاگر کیا:  
"تقسیم کے افسانوں میں بہترین افسانے اسی صورت حال کو موضوع بنا کر لکھے گئے  
ہیں۔ بٹے ہوئے خاندان اور اُجڑتے ہوئے مکانوں کی ان کہانیوں میں قوت ان کی  
گزشتہ اور موجودہ حالت کے تقابلی بیان سے پیدا کی جاتی تھی۔" (10)

کرشن چندر آزادی، ہجرت اور فسادات جیسے بڑے واقعات کو یاد کرنے سے پہلے ہمیں ہندوستان کے ماضی  
قریب میں لے جاتے ہیں۔ جو لوگ تقسیم کو ناگزیر اور اس سے جڑے حادثات کو ہندو، مسلم اور سکھوں کے اندر کے

شدید بغض سے بھرے جذبات سے جوڑتے ہیں، کرشن چندر انہیں "جلیانوالہ باغ" کا خونخوار سانحہ یاد دلاتے ہیں۔ وہ ہندو ہوں کہ سکھ، مسلمان ہوں یا خدا کے انکاری، انگریز سرکار سے تو سبھی سوراخ چاہتے تھے۔ مگر تقسیم...؟ آپسی بٹوارہ تو کبھی کسی نے نہ چاہا تھا۔ جلیانوالہ باغ میں تو سبھی ایک جُٹ تھے:

"آزادی کی خاطر، ہندو، مسلمان اور سکھوں نے مل کر اپنے سینوں کے خزانے لٹا دیے اور پانچوں دریاؤں کی سر زمین میں ایک چھٹے دریا کا اضافہ کیا تھا۔ آزادی.. آزادی..

آزادی.."(11)

جو لوگ ہندو، سکھ اور مسلمانوں پر جنونیت بھرے عقائد کی آڑ میں لوٹ مار کا الزام دھرتے ہیں، کرشن چندر ان کے سامنے جلیانوالہ باغ کے سانحہ میں گولیوں سے چھلنی پر کاش اور صدیق کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اگر یہ سب دولت لوٹنے کے لیے تھا تو کیوں ایک شدید زخمی اور غریب مسلمان لڑکے نے پرکاش کی انگلی میں جڑی ہیرے کی انگوٹھی اور جیب میں دو ہزار کے نوٹوں کی پروانہ کی۔ کیوں وہ آخری سانس تک اپنے دوست کی جان بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ کیوں کرفیو میں ہندو، مسلم اور سکھ بیٹیوں نے انگریز استعمار کے سامنے گٹھے ٹیک کر ایک گلی سے گزرنا تک گوارا نہ کیا اور آزادی کی خاطر موت کو گلے لگا لیا:

"شام کور، زینب، پارو، بیگم، آج تم خود اس گلی سے سراونچا کر کے نہیں گزری ہو۔۔۔

آج آزادی کا اونچا جھنڈا اس گلی سے گزر رہا ہے۔ آج انسانیت کا سر غرور سے بلند ہے۔

تمہاری روحوں پر ہزاروں، لاکھوں سلام..."(12)

مگر افسوس، آزادی کے بعد ہندوستانوں نے جلیانوالہ باغ کی قربانیوں کو بھلا دیا۔ گہری سازشوں نے انہیں ایسا بھٹکایا کہ وہ انسانیت بھول کر درندے بن گئے۔ جس دیس میں لسی اور دودھ پانی کی طرح بہتا تھا وہاں ریلوے سٹیشنوں پر ایک دوسرے کے لیے پانی بند کر دیا گیا۔ بوڑھے، بچے اور مائیں پانی کے لیے بلک رہی تھیں:

"کل کا بھائی آج کا دشمن ہو گیا تھا۔ اور کل جس کو ہم نے بہن کہا تھا، وہ آج ہمارے لیے طوفان سے بھی بدتر تھی۔ اور کل جو ماں تھی، آج بیٹے نے اس کو ڈائن سمجھ کر اس کے

گلے پر چھری پھیر دی تھی۔ پانی ہندوستان میں تھا۔ اور پانی پاکستان میں بھی تھا۔ لیکن  
پانی کہیں نہیں تھا۔ کیونکہ آنکھوں کا پانی مر گیا تھا۔" (13)

جس آزادی کے لیے ہندوستانیوں نے ایک دوسرے پر جانیں نچھاور کی تھیں۔ آزادی ملتے ہی انہی  
شہیدوں کے وارثوں نے ایک دوسرے کو درندوں کی طرح نوچ ڈالا۔ اگر یہ آزادی تھی تو اس سے غلامی کیا بری  
تھی۔ وشنو، کرشن اور رام کے بھکت، والمیکی، بدھ، گرونانک اور کبیر کو پڑھنے والے کہاں گئے۔ محسن انسانیت محمدؐ کی  
تعلیمات، سارا ادب، تہذیب، ثقافت اور روایات کہاں دفن ہو گئیں؟

بٹوارہ کرنے والے سیاستدانوں نے مذاہب، عقائد، لباس، طرز زندگی اور زبان کے مختلف ہونے کا بہانہ  
بنایا۔ مگر پنجاب میں تو ثقافت، تہذیب، لباس اور زبان سبھی ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جڑے تھے۔  
جلیانوالہ باغ، امرتسر پنجاب میں ہی تو تھا۔ لاہور کے پنجابیوں کو ہی زندہ دل پکارا جاتا تھا۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال،  
سسی پنوں جیسے عشاق، گرونانک، بلھے شاہ، وارث شاہ، شاہ حسین، بابا فرید سے خواجہ فرید تک سبھی صوفی بزرگ اسی  
دھرتی سے تھے۔ کیا کسی نے پنجابیوں سے پوچھا کہ وہ تقسیم چاہتے ہیں کہ نہیں۔ اور اگر چاہتے بھی ہیں تو کس  
طرح..؟ مگر پنجاب کا بٹوارہ کرنے والے سیاستدان تو گجراتی، کشمیری اور بنگالی تھے۔ انہیں پنجاب کا دل چیرتے وقت  
کیوں احساس ہونا تھا۔ انہیں اس سے کیا کہ بچ آج کہاں ہیں۔ ان کو کیوں پروا ہوتی کہ سکھوں سے ان کا مکہ مدینہ  
(ننکانہ صاب اور کرتار پور) چھینا جا رہا ہے:

"جمہوریت کے پرستار و ذرا پنجاب کے کسانوں سے، اس کے طالب علموں سے، اس  
کے کھیت کے مزدور سے، اس کے دوکان داروں سے، اس کی ماؤں، بیٹیوں، بہنوں ہی  
سے پوچھ تو لیا ہوتا کہ اس نقشے پر یہ جو کالی لکیر لگ رہی ہے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال  
ہے؟ مگر وہاں فکر کس کو ہوتی۔ کسی کا اپنا دیس ہوتا، کسی کا اپنا وطن ہوتا، کسی کی اپنی  
زبان ہوتی، کسی کے اپنے گیت ہوتے تو وہ سمجھ سکتا کہ یہ غلطی کیا ہے اور اس کا خمیازہ  
کسے بھگتنا پڑے گا۔" (14)

کرشن چندر چونکہ ایک نمائندہ ترقی پسند ادیب تھے اور بہت سے ادیب اور انقلابی ان سے ترقی پسند نقطہ نظر پیش کرنے کی پر زور امید رکھتے تھے اس لیے کہیں کہیں وہ دھیرے سے چلتی سرل کہانی میں دھکے سے نعرہ لے آتے ہیں۔ یہی کام فیض صاحب نے بھی اپنی دو ایک نظموں میں کیا ہے۔ فسادات میں مارے جانے والے اپنے ایک کشمیری مسافر کردار سے کرشن چندر کہلاتے ہیں:

"ظالمو! تم نے مسلمان کو نہیں مارا ہے۔ تم نے انسان کو مارا ہے۔ تم نے ہندوستان کو مارا ہے۔ تم نے تاج محل، فتح پور سیکری اور شالامار کو قتل کیا ہے۔ یہ اشوک کی لاش ہے۔ یہ اکبر کا کفر ہے۔ یہ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کا مردہ ہے۔ یہ مردور سیاست دان ہندو اور مسلمان، یہ سمانتی جاگیر دار، یہ فریبی سرمایہ دار کس کے خون سے اور کس کی بربادی سے اپنی حکومتوں کی تعمیر کر رہے ہیں۔" (15)

کرشن چندر کی تحریروں کا ایک اہم حوالہ فلم بھی تھا۔ اس لیے وہ اپنی تحریر کو مختلف تکنیکوں سے سجانے اور فکشن کو حقیقت بنا کر دکھانے کا ڈھنگ خوب جانتے تھے۔ افسانہ "ایک طوائف کا خط، پنڈت جواہر لال نہرو اور قائد اعظم جناح کے نام" میں خط کی تکنیک کو بخوبی استعمال کرتے ہوئے ایک طوائف کے ذریعے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ فارس روڈ ممبئی کی ایک طوائف پنڈت نہرو اور قائد اعظم محمد علی جناح کو خط لکھ کر ہندو لڑکی بیلا اور مسلمان لڑکی بتول کے بارے میں بتاتی ہے جنہیں ان کے علاقے کے مسلمان اور ہندو بلوائی وحشیہ بازار میں بیچ گئے تھے۔ ان کے ماں باپ اور بہنوں کی جان، مال، عزتیں لوٹ لی گئی تھیں۔

اب وہ طوائف ان معصوم بچیوں کو گندگی سے بچانے کے لیے یہ چاہتی ہے کہ جناح صاحب ہندو لڑکی بیلا اور پنڈت نہرو مسلمان لڑکی بتول کو اپنی بیٹی بنا لیں اور انسانیت سوز درندوں کے مقابلے میں انسانیت کا ثبوت دیں۔ تاکہ بیلا اور بتول کو تقسیم کا کچھ تو فائدہ ہو۔ یا کم سے کم بٹوارے سے لگنے والے زخموں کا کچھ تو مرہم ہو۔ اگرچہ بتول کے باپ کو ظالم جاٹوں نے بے دردی سے ذبح کر دیا۔ مسلمانوں نے بیلا کی ماں کے پستان کاٹ ڈالے۔ دونوں کمسن بچیوں سے معصومیت چھین لی گئی:

"پھر بھی ہمارے ملک میں آزادی آگئی۔ ہندوستان میں اور پاکستان میں۔ اور شاید ایک  
 طوائف کو بھی اپنے رہنماؤں سے یہ پوچھنے کا حق ہے کہ اب بیلا اور بتول کا کیا ہوگا؟ بیلا  
 اور بتول دو لڑکیاں ہیں۔ دو قومیں ہیں۔ دو تہذیبیں ہیں۔ دو مندر اور مسجد ہیں۔ بیلا اور  
 بتول آج کل فارس روڈ میں ایک رنڈی کے ہاں رہتی ہیں۔" (16)

افسانہ "جیکسن" تو ایک مکمل ڈرامائی انداز لیے ہوئے ہے۔ لاہور کا اینگلو انڈین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر جیکسن  
 ہندوؤں کو بحفاظت لاہور سے امرتسر بھیجنے کی بجائے ہندو، مسلم فسادات کرواتا ہے۔ وہ دونوں طبقوں کے لیڈروں کو  
 خطیر رقم کے بدلے اسلحہ بھی فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ہندوستان اور یہاں کے باسیوں سے نفرت کرتا ہے اور انہیں  
 لڑتا مرنادیکھنے میں سکون محسوس کرتا ہے۔ جیکسن اپنی دونوں بیٹیوں کو پندرہ اگست کو ہی انگلستان لے جانا چاہتا ہے۔  
 جہاں وہ انہیں اپنی دولت کے سہارے اونچے انگریز خاندانوں میں بیاہ سکے۔ وہ اپنی اینگلو انڈین بیوی کو طلاق دے کر  
 خود بھی کسی خالص انگریز لڑکی سے شادی رچانا چاہتا ہے۔ مگر جیکسن کی جان سے پیاری بیٹی روزی، جو اس کی طرح  
 ہندوستانوں سے نفرت کرتی ہے، خط کے ذریعے اسے ایک ہندوستانی لڑکے سے محبت اور شادی بارے آگاہ کرتی ہے۔  
 وہ بتاتی ہے کہ اسے ہندوستان کی تہذیب و روایات اور اس کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے کس قدر محبت ہو گئی  
 ہے:

"مجھے کتھاکلی اور بھارت ناٹم کے رقص کی ابدی غنائیت سے عشق ہو گیا ہے۔ غور سے  
 دیکھو تو معلوم ہو گا کہ ہمارے چہرے بالکل انگریزوں سے نہیں ہیں۔ ان میں پانچ ہزار  
 سال پرانے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں۔ تم میں، سنتھیا میں، ماما میں۔ ہم سب  
 ہندوستانی ہیں۔۔۔ تم نے میگھ دوت کا ترجمہ نہیں پڑھا اور نہ ہندوؤں کو کبھی وحشی نہ  
 کہتے۔" (17)

اور پھر افسانے کا اختتام بھی فلمی انداز میں ہوتا ہے۔ روزی فسادات کا شکار ہونے والے ہندوستانیوں کی  
 مددگار ہو جاتی ہے اور اپنے انقلابی ساتھیوں کے ساتھ ان کا مرہم بن جاتی ہے۔ جبکہ اپنے خوابوں کی کرچیوں سے زخمی  
 جیکسن خود کشی کا راستہ چن لیتا ہے۔

افسانہ "اندھے" میں اندرونِ لاہور میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات کا نقشہ کھینچا گیا ہے، تو "لال باغ" میں ممبئی شہر میں مسلمانوں کا قتل عام دکھلایا گیا ہے۔ اسی طرح "جانور"، "دوسری موت"، "ایک وائلن سمندر کنارے"، "امر تسر: آزادی سے پہلے" اور "امر تسر: آزادی کے بعد" جیسے افسانے بھی تقسیم، ہجرت اور فسادات کو موضوع بناتے ہیں۔

کرشن چندر ایک مارکسسٹ، انقلاب پسند اور ترقی پسند ہے۔ اس لیے فسادات میں انسانیت سوز اعمال، درندگی اور بے چارگی دیکھ کر بھی یاس اور ناامیدی کا دامن نہیں تھامنا چاہتا۔ اسے یقین ہے کہ انسان دوبارہ انسانیت کی طرف پلٹے گا اور یہ ظلمت اور بربریت کا دھواں ایک نہ ایک دن چھٹ جائے گا۔ اچھے انسانوں کی محنت اور ہمارے شہیدوں کا لہورنگ لائے گا۔ ہماری آنے والی نسلیں انقلاب اور شعور کے ذریعے انسانیت کا راستہ اپنائیں گی۔ وہ کشت و خون کا دریا عبور کرنے والی "پشاور ایکسپریس" سے کہلواتا ہے:

"میں چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے۔

میں قحط زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں گی۔ میں کونلہ اور تیل اور لوہا کے کارخانوں میں

جاؤں گی۔ میں کسانوں کے لیے نئے ہل اور نئی کھاد مہیا کروں گی۔۔۔ جب نہ کوئی ہندو

ہو گا نہ مسلمان، بلکہ سب مزدور ہوں گے اور انسان ہوں گے!" (18)

کرشن چندر ان عناصر پر طنز کرتے ہیں جو ادیبوں کو ادب برائے زندگی سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ استعمار کے کارندے انہیں ہاتھ کٹو دینے کی بزدلی بھری دھمکیاں دے کر اپنی ذمہ داری سے دور کر دینا چاہتے ہیں۔ انہی کے کارندے ادیبوں کو ادب برائے ادب اور ادب برائے تفنن میں لگن رکھنا چاہتے ہیں۔ کرشن چندر فریب خوردہ ادیبوں سے کہتے ہیں:

"ایک ہیچمدان افسانہ نگار کو ان باتوں سے کیا۔ اسے زندگی سے، سیاست سے، علم و فن

سے، سائنس سے، تاریخ و فلسفے سے کیا لگاؤ۔ اسے کیا غرض کہ پنجاب مرتا ہے یا جینتا

ہے۔ عورتوں کی عصمتیں برباد ہوتی ہیں یا محفوظ رہتی ہیں۔ بچوں کے گلے پر چھری

پھیری جاتی ہے یا ان پر مہربان ہونٹوں کے بوسے مثبت ہوتے ہیں۔ اسے ان سب

باتوں سے الگ ہو کر کہانی سنانی چاہیے، اپنی چھوٹی موٹی کہانی۔ جو لوگوں کے دلوں کو

خوش کر سکے۔ یہ بڑے بول سے زیب نہیں دیتے۔" (19)

جس طرح ایک سچا پیامبر معاشرے میں کسی قسم کی زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک سچا ادیب بھی کسی پہ ظلم ہوتا دیکھ نہیں پاتا۔ پھر چاہے زمانہ اس سے جیسا بھی سلوک کرے وہ ہر حال میں بس مظلوم کا ہی حمایتی رہتا ہے۔ بھیشم ساہنی اور کرشن چندر نے بھی ادب میں یہی پیغمبری شیوا اپنایا ہے۔ دونوں ادیبوں نے "ہنگامی ادب" کے طعنوں کی پروا کیے بغیر تقسیم، ہجرت اور فسادات کو نا صرف بیان کیا ہے بلکہ بہت سے ادیبوں کی بانسبت غیر جانبداری اور اپنی ادبی ذمہ داری کو نبھانے کی کوشش بھی کی ہے۔

بھیشم ساہنی نے زندگی کا بڑا حصہ راولپنڈی میں گزارا تھا۔ اس لیے ان کی تحریروں میں پنڈی کی یادیں اور دھرتی سے پھڑنے کا دکھ صاف جھلکتا ہے۔ انہوں نے دور دراز (ممبئی) میں ہجرت کی تھی۔ جہاں پنجاب کا ماحول، ثقافت اور زبان، کچھ بھی تو نہ تھا۔ مگر بھیشم ساہنی نے کٹھن سے کٹھن حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ وہ افسانے میں بھی کہیں خود کو جذبات کی رو میں بہنے نہیں دیتا۔ بلکہ کہانی سناتے ہوئے مزاج کے توازن اور دھیمے پن کو قائم رکھتا ہے۔ ہاں اس کے مقابلے میں کرشن چندر ذرا احساس ادیب ہے اس لیے تحریر میں کبھی کبھار مظلوم کے حق میں جذباتی بھی ہو جاتا ہے۔ اس حساسیت میں کچھ ترقی پسند تحریک کا بھی عمل دخل ہے۔ مگر یہی جذبہ اسے حق گوئی کا حوصلہ بھی دیتا ہے اور شاید اسی حوصلے کی بابت اس سے کچھ شاندار تحریریں بھی سر زد ہوئیں۔

اپنی کہانیوں میں کرشن چندر اور بھیشم ساہنی نے مشکل حالات، استعماری طاقتوں، بگاڑ پیدا کرنے والے عناصر اور فقط اپنے مخصوص طبقے کے قارئین کا لحاظ رکھنے کی بجائے حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنا مضبوط بیانیہ حق کے متلاشیوں کے سامنے رکھ چھوڑا ہے۔ جمہوری سیاستدانوں اور انگریز حکومت کی طرف سے کی گئی ایک ایسی تقسیم جس میں جمہور کی رائے کو ضروری ہی نہ سمجھا گیا۔ دونوں ادیبوں نے ہندوستان اور بالخصوص پنجاب کی غیر منصفانہ اور اندھا دھند تقسیم پہ نہ صرف مضبوط سوال اٹھائے ہیں بلکہ ہجرت سے پہلے اور بعد میں ہونے والے فسادات کے اصل ذمہ داروں اور ان کے مذموم مقاصد کو بھی بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے۔

## حوالہ جات

- 1- بھیشم ساہنی، امرتسر آگیا ہے، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2020ء)، مترجم: انعام ندیم، ص 24
- 2- ایضاً، ص 31
- 3- ایضاً، ص 36
- 4- ایضاً، ص 28
- 5- ایضاً، ص 52
- 6- ایضاً، ص 52
- 7- علی سردار جعفری، دیباچہ، ہم وحشی ہیں، از: کرشن چندر، (لاہور: بک ہوم، 2004ء)، ص 7
- 8- ایضاً، ص 10
- 9- ایضاً، ص 13
- 10- نیر مسعود، افسانے کی تلاش، (کراچی: شہزاد، 2011ء)، ص 53
- 11- کرشن چندر، ہم وحشی ہیں، (لاہور: بک ہوم، 2004ء)، ص 68
- 12- ایضاً، ص 93
- 13- ایضاً، ص 80
- 14- ایضاً، ص 76-75
- 15- ایضاً، ص 34-33
- 16- ایضاً، ص 42
- 17- ایضاً، ص 64-63
- 18- ایضاً، ص 104
- 19- ایضاً، ص 76